اسد محمد خان کے فکری دوائر۔۔۔ایک تحقیقی مباحثہ

سہیل ممتاز خان

ABSTRACT:

Asad Muhammad Khan is an established diversified fiction writer who engulfs a number of thought provoking ideas and characters in his stories. He roams through places to civilizations without any major hindrance and recreate dooms cultures and societies which are now part of our history or anthropology. He artfully does polish those features of human life which are marginally neglected and considered less valued to be written. History, time callousness, chivalry, politics, nature, feminism and family once exalted status are his favorite topics of concern. His writing style is lucid, clear and communicative but at some places it requires some special attention and an academic grasp. He explores different fiction techniques from narration to montage and from flash back to collage. He admires interregnum of Surry Dynasty and utterly abhors human decadence.

اسد محمد خان کی کہانیاں، متعدد فکر انگیز پہلو سمیٹے، قاری سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کو کسی ایک فریم ورک میں رکھ کر سمجھنا، دشوار ہے۔ یہاں موضوعات کی ایک ایسی رنگا رنگی ہے جسے گرفت میں لانے کے لیے چند بنیادی فکری تنوعات سے آگاہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔یعنی کہانی کے مختلف روپ، اپنے پس منظر میں چند مشترک آسان اور سادہ_____ اور کہیں پیچیدہ خیال پرور تلازمات سمیٹے ہوئے ہیں۔فکر و تخیل کے یہ بہتے دریا، کئی طرح کی زمینوں اور خطوں سے گزرتے ہیں اور قاری کے لئے نئے اور منفرد موضوعات کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک طرف عہد نامہ عتیق کی بازگشت ہے تو دوسری جانب سوری عہد اور اس کے متعلقات سے فکری و تحقیقی جواہر کی تلاش ملتی ہے اور انہیں کے ساتھ ہندو دیو مالا اور معاصر زندگی کا بحران برے بھلے کرداروں، علامت، تجرید

اور سادہ بیانیے میں صورت پذیر ہوتا ہے۔تنوعات اور انفرادیت کے اس میلے میں،ہمیں ان گنتی کی چند چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے جو افسانہ نگار کی کہانیوں میں تانے بانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کہانیوں کا ایک معتد بہ حصہ، افسانہ نگار کی ذات اور خاندان کی شناخت سے جڑا ہوا ہے۔ان تحریروں میں کہانی کار،عرفان ذات کے ساتھ خاندانی معاملات و مسائل کی تفہیم اور اپنے پرکھوں کو جاننے کا جتن کرتا ہے اور یہ جتن اس لیے بھی ہے کہ ان کا خاندان کبھی ہندوستان کی وسطی ریاست بھوپال کی حکمرانی کا لطف اٹھا چکا تھا۔اب وہ ذاتی حیثیت میں اور خاندان کے حوالہ سے جس سماجی درجے سے نیچے آ گئے ہیں وہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں ان کے لئے سوہانِ روح ہے۔جو کہانیاں براہ راست خاندان،نسل اور ذات کے متعلقات سے وابستہ ہیں ان میں 'یوم کپور'، 'باسودے کی مریم'، 'مئی دادا'، 'ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی' 'ایک ٹکڑا دھوپ کا'، 'طوفان کے مرکز میں' اور 'گھر' کو شامل کر سکتے ہیں۔ان کہانیوں کا مرکزی تھیم قریباً ایک سا ہے۔خاندان اور ذات کے بحران کا یہ المیہ،موضوعاتی سطح پر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی جستجو کا ایک اور روپ ہے۔یعنی ان مذکورہ افسانہ نگاروں کے ہاں خود کو اور خاندان کے ساتھ اس تہذیب و معاشرت کی بھی تلاش ملتی ہے جسے وہ نہ چاہتے ہوئے کھو چکے ہیں۔اس سانحاتی تلاش میں مذکورہ تینوں لکھنے والوں کے ہاں عدم شناخت، بے چہرگی، سماجی تنزل اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا احساس شدید تر ہے۔زندگی کا وہ خوبصورت سبھاؤ جو انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں حاصل تھا تقسیم (۴۷ء) کے بعد نہ رہا۔خاندان کی قدر و منزلت اور رکھ رکھاؤ کے طور طریقے یکسر بدل گئے اور پھر عافیت اور اطمینان کے جو سامان میسر تھے وہ عنقاء ہو گئے۔یہ وہ بنیادی المیاتی فضا ہے جو خاص طور سے افسانہ نگار کی کہانیوں میں سر اٹھاتی ہے:

> ''اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سروتا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت مئی دادا کو گھر آ جانا چاہیے۔میاں......آج ہمارے پشتینی اہلکار کو......ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے،تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی؟ آئیں! اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔بولتی ہی چلی گئیں۔غالبؔ کے شاگرد نواب یار محمد خان شوکت کی پوتی تھیں۔ایک جید نواب زادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طلاقت لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔''[۱]
>
> (مئی دادا)

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسد محمد خان مذکورہ امر میں، انتظار حسین کے مقلد ہیں بلکہ یہ سب کا اپنا اپنا اور ذاتی دکھ ہے کہ ۴۷ء سے کوئی ایک شخص متاثر نہ ہوا تھا۔یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت تھی۔ایک کروڑ سے زائد دربدر خاک بسر ہوئے، اور بیس لاکھ کے قریب کشتنی قرار پائے۔اس نے کئی نسلوں اور خاندانوں کو اذیت ناک تجربات اور روح فرسا بحرانوں میں لا کھڑا کیا۔وجود کی پامالی کے ساتھ، خیالات و تصورات بھی روندھ ڈالے گئے اور پھر رہی سہی کسر ۷۱ء کے سانحے نے پوری کر دی۔اس نے انتظار حسین سے ''بستی'' آباد کرائی اور اسد محمد

خان سے ''گھر'' کو۔ یعنی وہ خاندان جو ۴۷ء کے بعد دو زمینی خطوں میں منقسم ہو چکے تھے اب ۷۱ء کی واردات کے بعد تین زمینی ٹکڑوں میں بکھر گئے۔ مذکورہ سانحات اور داخل و خارج کی اس ابتری نے قریباً ہر سوچنے، سمجھنے والے کو متاثر کیا اور پھر بڑا لکھنے والا تو ہر صورت، اپنے کتھارسس کے معاملہ میں اوروں کی نسبت، خوش بخت رہتا ہے۔ ۷۱ء کے سانحے کو اسد محمد خان اپنی ذات اور خاندان کے پس منظر میں کس طرح سے دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک متاثر کن جھلک ہمیں ان کے ''گھر'' میں ملتی ہے:

> ''میرا یہ گھر پہلے پہل برگد کے ایک چھتنار درخت کے سائے میں بنایا گیا ہوگا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ گھر پھیل کر پہلے برگد کے گردا گرد بنتا رہا، پھر برگد سے اونچا نکل گیا۔ اور اب برگد کی سب سے اونچی ٹہنیوں سے؛ جہاں دوپہروں میں ہریل اور مینائیں پناہ لیتی ہیں، میرے گھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ دراصل برگد کا یہ درخت مکان کے فرش میں دفن ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک زندہ چیز کو اپنی مسہریوں، چارپائیوں، تپائیوں اور سلفچیوں کے نیچے دفن کر رکھا ہے اور اس پر چل پھر رہے ہیں، تہبند بدل رہے ہیں، کھانس رہے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔''[۲]

خاندان اور نسل کے تعارفی جغرافیے میں، کہانی کار کہیں کہیں جذباتی، زود حس اور تفاخر سے مملو گفتگو کرتے ہیں۔ کہانی کے یہ حصے قاری کو کھٹکتے ہیں تاہم کہانی کا مجموعی اثر، پڑھنے والے کو اپنی گرفت ہی میں رکھتا ہے۔

کہانیوں کا ایک اور بڑا پس منظر، شیر شاہ سوری، اس کے عہد اور اس سے وابستہ مختلف النوع معاملات و واقعات کو پیش کرتا ہے۔ مسلم تاریخ میں صرف شیر شاہ عہد سے وابستگی اور صرف اس عہد کو مثالی اور قابلِ تقلید جاننے کے جملہ اسباب کی نوعیت جہاں ذاتی انسیت سے متعلق ہے وہیں ان کا غیر جانبدار مطالعہ انہیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ یہی وہ مسلم حکمران تھا کہ جس نے رعایا میں نظام عدل کے ایک باقاعدہ مربوط، منصوبے کی بنیاد رکھی اور سلطان عادل کا خطاب حاصل کیا۔ نظام عدل کے حوالہ سے یوں تو اور بھی کئی مسلم حکمران اپنی شناخت رکھتے ہیں تاہم جو پذیرائی اور شہرت، اس مسلم حکمران کو انتہائی مختصر دور حکومت میں میسر آئی وہ بہتوں کو پچاس پچاس سال تک حکومت کرنے کے باوصف حاصل نہ ہوئی اور مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں جابر اور سفاک کہلوائے۔

نظام عدل کی عملی صورت اور رعیت کے لئے ذرائع آمد و رفت اور قیام و طعام کا بہترین نظام و انصرام اس شے کا پتہ دیتا ہے کہ موضوع بحث کردار کن اسباب کے نتیجے میں دوسرے حکمرانوں پر تفوق رکھتا ہے۔ شاید اس لیے اسد محمد خان اپنی ایک کہانی ''جشن کی ایک رات'' میں قدرے ملال سے کہتے ہیں:

> ''صحت یابی کے بعد سلطان شیر شاہ نے خود کو جشن کی یہ ایک رات دینا منظور کیا تھا۔ مگر اس ایک رات کے آگے پیچھے، حرب و جدال کی جانکاہ مشقتوں اور مشکل فیصلوں کے کرب سے پسینا پسینا بے شمار راتیں تھیں جن کا حساب کسی وقائع نگار نے اس طرح نہ رکھا جیسا کہ حساب رکھنے کا حق ہوتا ہے اور جب دیکھتے ہی دیکھتے معاصر تاریخ کا آگ برساتا سورج سوا نیزے

پر آ پہنچا تو بہت سی چیزیں اپنے معنی کھو بیٹھیں اور مٹی ہو گئیں۔
بس پتھر کی ایک سفید سل کہیں پڑی رہ گئی جس پر ادھیڑ عمر کے ایک آدمی کو شیر سے پنجہ کرتے
دکھایا گیا تھا۔''۳

مذکورہ تاریخی کردار سے وابستگی کے تناظر میں ہمارا ذہن کئی اطراف میں دوڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح انتظار حسین گرد و پیش کے بھیانک ماحول سے ادبدا کر، دیو مالا، تاریخ اور بودھ جاتک کہانیوں میں جا نکلتے ہیں اسی طرح اسد محمد خان بھی کہانیاں کہتے کہتے ہر پھر کر تاریخ اور پھر تاریخ میں مجموعی طور پر ایک ایسے دور کو جا لیتے ہیں جہاں انہیں ہر شے نک سک سے درست اور مثالی معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال کی مسلم تاریخ میں پانچ سال سے بھی کم مدت کے دور حکومت کی اتنی اہمیت؟ معلوم یہ ہوا کہ جب افسانہ نگار اردگرد کے ماحول سے سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے بقول اقبالؔ:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

تو وہ کسی دیو مالا یا جاتک کہانی میں پناہ نہیں لیتے بلکہ ایک ٹھوس اور نا قابل تردید حقیقت سے ہمیں شناسا کرتے ہیں، ان کی مصالحت قصے کہانیوں یا مفروضات سے نہیں ہوتی بلکہ وہ ان حقائق کو سامنے لاتے ہیں جن کا جاننا آج کے ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔

مذکورہ مسلم تاریخی شخصیت کو افسانہ نگار جن کہانیوں میں محور فکر بناتے ہیں ان میں گھڑی بھر کی رفاقت، غصے کی نئی فصل، جشن کی ایک رات، ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری، نربدا، (جزوی طور پر) ندی اور آدمی، روپالی اور کھلتی دھوپ اور اجلتے سائے قابل ذکر ہیں۔ منجملہ کہانیوں میں صرف ایک کہانی غصے کی نئی فصل، جو مذکورہ شخصیت سے کسی قدر ناراضگی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ ورنہ یہ تمام کہانیاں کسی نہ کسی رنگ میں شیر شاہ سوری سے مؤدت کا اظہار کرتی ہیں۔

تاریخ کے چند اور دورانیے بھی افسانہ نگار کی کہانیوں میں مثالی اور غیر مثالی حیثیت میں موجود ہیں۔ مثلاً علاؤ الدین خلجی اور اس کا عہد اور پھر سلطان فیروز شاہ تغلق کا دورِ حکومت بالترتیب رگھوبا اور تاریخ فرشتہ، اور دارالخلافے اور لوگ، میں ملتا ہے۔ ان ادوار کو قصے کا موضوع بناتے ہوئے افسانہ نگار غیر جانبداری برت کر انسانی اقدار اور احترام کا ایک فراخ مسلک پیش کرتے ہیں۔ یہاں وہ ادنیٰ درجے کے ادیبوں کی مانند، کسی مثالی اور جذباتی جنون میں مبتلا ہو کر، تاریخی حقائق کو مسلم عقیدت سے مسخ نہیں کرتے۔ متذکرہ کہانیوں میں مسلم حکمرانوں اور ان کے گماشتوں نے جو انسانیت سوز رویے اپنائے انہیں افسانہ نگار، بغیر کسی تامل اور حیل و حجت کے بیان کرتا ہے۔

''ملک نصرت نے قاتلوں (مغلوں) سے یوں بدلہ لیا کہ ان کے بچوں، عورتوں کو خاکروبوں
کے سپرد کر کے حکم دیا...... کہ دودھ پیتے بچوں کو ان کی ماؤں اور بہنوں کے سروں پر اس طرح
مارا جائے کہ بچے ختم ہو جائیں ...... اور اس حکم پر عمل ہوا۔ بچے دھنکی ہوئی روئی کی طرح
چیتھڑے چیتھڑے...... پھر ان بدنصیب عورتوں کو رسوا اور ذلیل کر کے بے دینوں کے سپرد کر

دیا......ہائے زمانے......ملامت ہوزمانے...... تجھ پہ ملامت......واویلا ہو زمانے، واویلا ہو واویلا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔''۴؎

یہ وہ تلخ اور اندوہناک واقعات ہیں جن سے سرزمین ہند کی مسلم تاریخ داغ دار ہے اور انھیں جھٹلانا ممکن نہیں کیونکہ ان واقعات کی تصدیق خود مسلم مؤرخین کی کتابوں سے ہوتی ہے مثلاً مذکورہ اقتباس میں درج افسوسناک واقعے کا ذکر، تاریخ قاسم فرشتہ میں صراحت سے ملتا ہے۔ ان کہانیوں کی قرأت سے یہ شے واضح ہوتی ہے کہ افسانہ نگار انسانوں سے بے دریغ اور بے تعصبی کے محبت کرتا ہے۔ انسانیت سوز رویوں کو ہدفِ ملامت بناتا ہے اور تاریخ میں صرف ان حکمرانوں پر والہ وشیدا ہوتا ہے جو خلق خدا کے لئے رحمت اور اطمینان کا موجب تھے۔ اپنی ایک اور منفرد کہانی 'قافلے کے ساتھ ساتھ' میں وہ شہاب الدین غوری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''کیا کہیں کسی شہاب الدین تک رسائی ممکن ہے، کیا نئے راستوں سے، میدانی علاقوں میں نکلنے کی کوششوں میں، کہیں کچھ قافلے کوچ کی تیاری میں ہیں۔''۵؎

اب ذرا دارالخلافے اور لوگ، کی آخری چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

''جو بھی ہو، صنوبر اور فتح خان کی کہانی عامیوں میں کئی طرح سنائی جاتی ہے اور لوگوں کو خوب یاد ہے۔ کس لیے کہ مار کھائے ہوئے محروم لوگ، وہ دلی میں ہوں یا خوشاب میں...... اور کہیں بھی کسی بھی عہد میں ہوں...... جابر سلطانوں سے 'ناں' کہنے والوں کو اور ان کی کہانیوں کو بہت شوق سے یاد رکھتے ہیں۔''۶؎

تاریخی کہانیوں میں شیر شاہ سوری کے بعد شہاب الدین غوری ہی وہ کردار ہے جسے افسانہ نگار پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بنیادی وجہ وہی انسانی احترام ہے جو عموماً سلاطین کے ہاں کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنی متعدد کہانیوں میں جو معاصر تاریخ اور سماج سے جڑی ہوئی ہیں وہ محبت اور دردمندی کے آفاقی جذبات، کینوس پر رنگوں کی صورت بکھیرتے، ایک ماہر مصور کی مانند بولتی تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی معاصر تاریخ اور تقویم پار ادوار میں ان کی جستجو کا حاصل اور اساسی مرکزہ ایک ہے۔ 'ہے للا للا، گھس بیٹھیا، چاکر، سے لون، سرکس کی سادہ سی کہانی، وقائع نگار، برجیاں اور مور، اور ہٹلر شیر کا بچہ وغیرہ ایسی تحریریں ہیں جن میں افسانہ نگار کچلے ہوئے اور راندۂ درگاہ افراد کے دکھوں میں شریک ہوتے ہیں اور رنجیدہ نظر آتے ہیں۔

''کہیں آگے چل کر جمیلہ کو وی ڈی یا ٹی بی ہوگئی۔ بس وہ اپنے انتیس برس پورے کر کے چلی گئی۔ اشک صاحب کے بیٹے، مرے مردے ماشٹر نے شادی کر لی۔ پھر ریڈیو کی نوکری چھوڑ پرچون کی دکان لگا لی۔ جانی خاں اور اس کی سارنگی کا میں بتا ہی چکا ہوں...... پر بیگم درشہوار کو رفی جرمن، سابق سیکٹر انچارج کی کوئی خبر نہیں ہو پائے گی۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سوں کے، مثلاً رمجو اجمیری وغیرہ کے عدم وجود کا بھی اسے کوئی پتا نہیں ہوگا۔

تو ایسا ہی ایک فضول سا بے توقیر انجام کہانی کے بیشتر لوگوں کو نصیب ہوگا کہ آں قدح بشکست

وآں ساقی نماند............ے

(اک میٹھے دن کا انت)

انسانوں کی سماجی حیثیت اور پیشے دھندے سے قطع نظر وہ انسانوں سے قلندرانہ محبت کرتے ہیں۔اس ضمن میں ان کا تجربہ اور مشاہدہ انہیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ انسانی زندگیوں کی بے وقعتی اور لاحاصلی کا ایک اہم سبب وقت یا زمانے کی بے رحمی ہے اور بیشتر خوبصورت زندگیاں، بے کار اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ وقت کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور وہ ایسی اکھاڑ پچھاڑ کرتا ہے کہ خوش بختی، تیرہ بختی میں اور روشنی، اندھیرے میں گھل جاتی ہے۔ وقت کا یہ جبری نظریہ ان کی کئی ایک کہانیوں میں کارفرما ہے۔

> ''مسئلہ یہ ہے کہ میں ان عام سے مگر غیر معمولی اور من موہنے لوگوں کو کوئی گرینڈ فنالے (GRAND FINALE) دینا چاہتا تھا، پر میں جانتا ہوں کہ وقت، جو اس کہانی کا (اور ہر کہانی کا) ایک حاوی کردار ہے، اس قدر جے لس جل ککڑا ہے کہ اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تو وہی سب کی اسپاٹ لائٹ چھینتا، سب ہی پر اپ اسٹے جنگ (UP-STAGING) کرتا، رنگ منچ پر دندناتا رہتا ہے............بس وہی دندناتا رہے گا۔''۸

وقت اور زمانے کے اس جبریہ پس منظر میں ہم ایسے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں جنہیں وقت کا ریلا اِن کی مرضی اور خواہشوں کے خلاف دھکیلے چلا جاتا ہے۔ان کہانیوں میں خاص طور سے، برجیاں اور مور،طوفان کے مرکز میں، سارنگ، رگھوبا اور تاریخ فرشتہ، اک میٹھے دن کا انت، نصیبوں والیاں، الی گجر کی آخری کہانی اور دارالخلافے اور لوگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

وقت کے اس جبری نظریے سے کوئی لاکھ اختلاف کرے لیکن جس اوریجنل انداز میں یہ کہانیاں مرتب ہوئی ہیں انہیں دیکھ کر ہم افسانہ نگار سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انسان جہاں بہت سی غیر مرئی اور غیر حسیاتی اشیاء سے لاشعوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے وہیں ہماری زندگیوں میں ''سیاست'' کی عمل داری ایک غیر محسوس طریقے سے زہر گھول رہی ہوتی ہے۔ اسد محمد خان سیاست کے اس بے رحم اور سفاکانہ طرزِ عمل کو جسے عموماً ہم اپنی زندگیوں سے خارج سمجھتے ہیں کو موضوع بحث بناتے ہوئے، چند خوبصورت کہانیاں تخلیق کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ گمان تیقن میں بدلتا ہے کہ ہماری زندگیاں بہرطور، ملکی اور غیر ملکی سیاست کے گورکھ دھندے میں ملوث ہیں۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کے آلۂ کار بنے رہتے ہیں اور باوجود کوشش کے، سیاست کے اِس ہمہ گیر جغرافیے سے، باہر آنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

سیاست کے اس تاجرانہ اور منافقانہ نظام کو جو ہمیں چرخ کج رفتار کی مانند قریباً ہر سمت سے گھیرے رکھتا ہے کو افسانہ نگار 'فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو، گنجے ایڈورڈ کا سورج اور سفید گایوں کے میسا کر میں نمایاں کرتے ہیں، اور پھر اپنی اس کاوش میں وہ تاریخ کے متعلقہ واقعات و معاملات کو بھی ٹٹولتے ہیں اور نتیجے میں ایک

سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری، اور شہر مردگاں......ایک کمپوزیشن ایسی کہانیاں وجود میں لاتے ہیں۔

یہاں افسانہ نگار کی جانب سے اس شے کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وقت اور زمانے کے تبدل کے باوصف، انسانی سرشت کا اسفل حصہ قریباً ایک سا ہی رہتا ہے اور انسان صاحب حیثیت ہونے کے باوجود، کم ظرفیوں اور کمینگیوں سے باز نہیں آتا۔ ذاتی مفاد اجتماعی مفاد پر قربان نہیں ہوتا۔ ہوا و ہوس اور حب دنیا اس سے نسل، قوم اور بہت سے بے گناہ لوگوں کی زندگیوں کا بیوپار کراتی ہے اور پے در پے رونما ہونے والے المیاتی واقعات، انسان کو بے ضمیری کا سودا کرنے سے نہیں روکتے۔ انسان ہرگز نہیں ڈرتا اور نہ مُردوں کے بیچ رہ کر، ان کی بے حرمتی اور خرید وفروخت سے گھبراتا ہے۔ مردہ گھر میں مکاشفہ، اور وقائع نگار کو اس ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

انسان دوستی، وقت کی جبریت، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے تاجرانہ رویے اور پھر انسان کی ادنیٰ اخلاقی حیثیت کے حوالہ سے ہونے والی مذکورہ گفتگو، افسانہ نگار کی کہانیوں کے فکری اجزاء کا کسی قدر احاطہ کرتی ہے۔ یہ وہ مشترک اوصاف ہیں جو ان کی کہانیوں میں جزوی اور کلی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔فکر کی اس اجزائے ترکیبی میں مظاہر فطرت کا اضافہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کیونکہ افسانہ نگار ان چند لکھنے والوں میں ہیں جن کے لیے فطرت کے حسین خدوخال تخصیصی وقعت کے حامل ہیں اور وہ انسانوں کے ساتھ ان کے گرد و پیش کے ماحول کو بھی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں فطرت کے خوبصورت مظاہر سفاکانہ انسانی رویہ کے سبب متاثر ہوں یا لوگوں کا ان کے حوالہ سے رویہ غیر مناسب انداز پر سامنے آئے تو وہ دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جہاں انسانی تذلیل پر چلا اٹھتے ہیں وہیں فطرت کی بیخ کنی پر بھی واویلا مچاتے ہیں۔ فطرت سے اس والہانہ لگاؤ کے پس منظر میں ان کی کہانیاں ''ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن'' اور ''سوروں کے حق میں ایک کہانی'' کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

فطرت سے وابستگی کا مذکورہ طرز عمل جدید افسانہ نگاروں کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ جبکہ افسانہ نگار کسی ماہر ماحولیات (ECOLOGIST) کی طرح اشیائے فطرت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے ہاں یہ رویہ خاص طور سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور منشا یاد کے ہاں بھی یہ طرز احساس کہیں کہیں موجود ہے۔ فطرت کے ارضی پہلوؤں کو اسد محمد خان اپنی اور بہت سی کہانیوں میں بھی جگہ دیتے ہیں اور پھر مظاہر کے اس تلازمے میں وہ اشیا خاص طور پر اہمیت اختیار کر لیتی ہیں جو انسان کے لئے عقیدت اور محبت کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔ یعنی دریا، پہاڑ اور ندی ان کی کہانیوں میں محض جمادات کی حد تک شامل نہیں بلکہ یہ ارضی حقیقتیں داخل کی اس دنیا میں جا شامل ہوتی ہیں جہاں انسان اشیاء سے اپنا تعلق غیر مادی حوالوں سے جوڑتا ہے۔ روح کے اس رابطے ضابطے میں رومانویت اور روحانیت کا معاملہ ایک امتزاجی کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے نربدا اور وندھیا چل کا پہاڑی سلسلہ جہاں عقیدت کے مختلف پہلو لیے ہوئے ہے وہیں ندی کرم ناسا، افسانہ نگار کے لئے، شیر شاہ سوری کے حوالہ سے، ایک معتبر اور نادر شے بن جاتی ہے، اور پھر اس ندی کرم ناسا کا ارضی پہلو نظر انداز ہو کر ایک متحرک اور جیتے جاگتے کردار کی حیثیت سے متشخص ہونے لگتا ہے۔

''گویا ایک ندی میں ہم تھے اور ایک ایک ندی ہم میں سے ہر ایک میں بہہ رہی تھی۔'' قربانت شوم!
اور سمجھو تو اس وقت بھی ہم ندی میں ہیں۔ ہم چاروں......شناور خان، نارنگ دیو، حسن بابا اور میں۔
اور پیرا کی کے استاد نے یہ بھی کہا تھا کہ ندی تمہارے بیچ بہتی رہے گی خواہ تم اس کے پتن چھوڑ کے کہیں دور جا بیٹھو۔''۹ (ندی اور آدمی)

زمین کے یہ جماداتی اور نباتاتی مظاہر، افسانہ نگار کی کہانیوں میں رچ بس کر ایک فراخ اور سیر نظری کا پس منظر فراہم کرتے ہیں اس سے ان کی کہانیوں کی معنویت جہاں بڑھتی ہے وہیں ایک پڑھنے والے کی بصیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اردو فکشن بالخصوص افسانہ نگاروں کے ہاں فطرت کے یہ ارضی پہلو، اس قدر جاندار انداز میں، بہت کم پیش ہوئے ہیں۔

اسد محمد خان کی افسانویت کا وہ فکر انگیز پہلو جو انتہائی متاثر کن اور پرامید ہے، پر بات کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ہم اب تک کی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے، غیر جانبداری سے کہانیوں کی بابت اپنا نقطۂ نظر واضح کر لیں۔ مثلاً تاریخ، سیاست اور تسلط وقت کے حوالہ سے پیش ہونے والی مختلف کہانیاں فکر اور اسلوب کی بنیاد پر ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہیں اور ان میں بعض کہانیاں تو ایسی ہیں کہ جن کی مغمومیت اور اداسی کا رنگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قاری کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ برجیاں اور مور، اک میٹھے دن کا انت اور نصیبوں والیاں سے سرسری گزرنا قریباً ناممکن ہے۔ یہ وہ ناقابل فراموش کہانیاں ہیں جو افسانہ نگار کی شناخت میں، ہمیشہ ایک معتبر حوالہ کا کردار ادا کریں گی۔ رگھوبا اور تاریخ فرشتہ، غصے کی نئی فصل اور روپالی سے لے کر سفید گایوں کے میسا کرتک کئی کہانیاں جہاں تاریخ اور سامراجی سیاست کے انسانیت سوز پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں وہیں فکر و دانش اور فن کے نئے کونے گوشوں کو بھی سامنے لاتی ہیں جن سے افسانوی اقلیم کی آحاد بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔تاہم مذکورہ پس منظر میں بیان ہونے والی چند کہانیاں ایسی بھی ہیں جو فکر وفن کے اعتبار سے افسانہ نگار کی، بہترین کہانیوں سے میل نہیں کھاتیں۔ ان میں فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو اور شہر مردگاں......ایک کمپوزیشن کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ مؤخر الذکر کہانی ایک خودنوشت کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کا اس میں کلی طور پر ایک سوانحی کردار کی حیثیت سے شامل ہونا قاری کے لئے ڈائی جیسٹو (Digestive) نہیں رہتا۔ اس سے کہانی کی معروضیت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور تحریر انتہائی ذاتی پیشہ ورانہ مصروفیات، تبصرے اور رائے زنی کے سبب افسانے کی حدوں کو توڑ ڈالتی ہے۔ ان دو کہانیوں کے سوا مذکورہ پس منظر میں پیش ہونے والی بیشتر تحریریں معیاری اور متاثر کن ہیں۔

خاندان، حصار ذات اور کرداری افسانوں میں افسانہ نگار کے ہاں رطب و یابس موجود ہے۔ بعض کہانیاں تکمیل فن کا جوہر دکھاتی ہیں اور کہیں پر کہانی چند قدم چل کر رک سی جاتی ہے۔ یوں تو اس تناظر میں بیان ہونے والی کہانیاں، باسودے کی مریم اور مئی دادا اردو افسانوی ادب میں ایک خاص شہرہ رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ

کہانیاں، جذبات و احساسات سے مملو، خاندان اور نسلی تفاخر کی بعض اشکال بھی پیدا کرتی ہیں۔ مثالیت پسندی یا رومانوی رنگ میں کہی جانے والی ان کہانیوں میں جا کر، اور اپنے لوگوں سے سنی ایک شگفتہ کہانی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور کرداری افسانوں میں بھی چند ایک ایسی کہانیاں ضرور مل جاتی ہیں جو شخصی خاکوں کی حد تک معقول معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں 'ایک بے خوف آدمی کے بارے میں'، 'ریڈیو والے نواب صاحب'، 'دیوان جی' اور 'پیدل ولندیزی' کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں جو تحریریں قاری کے ذہن و اعصاب پر خوشگوار اور معیاری اثر چھوڑتی ہیں ان میں 'گھس بیٹھیا'، 'سے لون'، 'طوفان کے مرکز میں'، 'جانی میاں'، 'ماشٹر'، 'عون محمد وکیل، بے بے اور کاکا' اور 'الی گجر کی آخری کہانی' شامل ہے۔ یہ کہانیاں فکر وفن کا ایک خوبصورت امتزاج سمیٹے حشو و زوائد سے بڑی حد تک مبرا ہیں۔ ایک ٹکڑا دھوپ کا اور ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی اپنی معروضی حیثیت میں افسانے کی ذیل سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں افسانے کے دائرہ میں شامل کرنے کے لئے کھینچا تانی کرنی پڑتی ہے۔ اپنی متنازع حیثیت کے باوجود مذکورہ تحریریں، اسلوب اور تخلیقیت کے معاملے میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ اب یہاں یہ مبحث پیدا ہوتا ہے کہ افسانے کی ذیل اور اس کی معروضی حیثیت کا تعین اور تیقن کیا ہوگا اور پھر یہ کہ ایک درجن سے زیادہ دیسی، بدیسی حوالے پیش کرتے ہوئے مزید الجھاؤ اور گنجل صورت پیدا کی جائے، یہ مناسب ہوگا کہ یہی خاطر جمع رہے کہ صنفی اعتبار سے افسانہ ــــــــ خاکہ نگاری، خودنوشت، سفرنامے اور رپورتاژ وغیرہ سے مختلف ہے اور اس کا تعین کار کبھی بھی حتمی و کامل نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس کا معروضی پیراڈائم ہم سب کے لئے معروف ہے۔

یہاں مشاہدات و تجربات، معلوماتِ عامہ، تاریخ اور تہذیبوں کے علوم وفنون کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ خصوصاً مؤخر الذکر کہانی جو خطوط کی تکنیک میں لکھی گئی کے معنوی دائرہ کار کو مزید بڑھائیں تو ایک گنجائش بہرحال نکلتی ہے کہ ایک بڑی کہانی یا داستان کئی ایک کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور کہیں بھی ایک کہانی مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی اور انسانی زندگی اور اس کی کتھا کسی بھی محدود دائرے میں سمٹنے سے معذور ہے۔

علامت، تجرید اور دیومالا کے ریفرنس میں بھی افسانہ نگار کے ہاں بعض کہانیاں ایک بسیط طیف پیما لیے ہوئے ہیں تاہم چند کہانیاں فکر وفن کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے میں کامیاب نظر نہیں آتیں۔ پھر یہ ناکامی ہر اس بڑے لکھنے والے کے ہاں موجود ہے جو تجربات اور مشاہدات میں انفرادیت اور تنوع کا قائل ہے۔ منٹو سے انتظار حسین اور غلام عباس سے رشید امجد تک ایسی متعدد کہانیوں کے حوالے دیے جا سکتے ہیں جہاں لکھنے والوں کے ہاں معیار کا معاملہ اوبڑ کھابڑ دکھائی پڑتا ہے۔ یہاں بھی معیارِ فن میں اونچ نیچ کا معاملہ، قابلِ مشاہدہ ہے:

> ''پریم چند کی ریالزم سے لے کر نئے افسانہ نگاروں کی میٹا بولزم تک اردو افسانے میں موضوع، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے ان گنت تبدیلیاں ریکارڈ کی گئی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ ہر عہد کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی واردات سمونے کا جتن کیا ہے۔ زندگی اور سماج کے متعلقات کو گرفت میں لینے کے ہنر میں ہمارے افسانہ نگار کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔''[۱۰]

غالبًا اسی مذکورہ منظر نامے میں بری بھلی تحریریں ایک ساتھ وجود پاتی ہیں نیک والدین کی بھی ساری اولاد اچھی نہیں ہوتی۔ لُچے لفنگے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے بڑے لکھنے والوں کی قد آوری میں فرق نہیں آتا اور بقول غالبؔ:

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اسد محمد خان نے علامت اور تجرید کے معاملہ میں جن خوبصورت تحریروں کو پیش کیا ان میں گھر، ترلوچن، مردہ گھر میں مکاشفہ، ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن، برج خموشاں اور سارنگ لائق ذکر ہیں۔ ان کہانیوں میں افسانہ نگار کا فن اپنی منتہا کو جا لیتا ہے اور پھر اگر ان میں بھی مزید درجہ بندی کی جائے تو گھر، ترلوچن اور سارنگ کو اول درجے کی علامتی کہانیوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہاں انفرادی اور اجتماعی غم_____ دیو مالا سے مل کر، معاصر آشوب کو گرفت میں لیتا ہے اور پھر تخیل، علامت اور متحرک تجرید کی صورت، منفرد سیلانی انداز میں، معنویت کی تہوں کو بچھاتا چلا جاتا ہے اور ان کی تفہیم میں کہیں کہیں ایسے فکری اسپارک ملتے ہیں کہ جنہیں بوجھ لینے پر کہانی کا ابلاغ دشوار نہیں رہتا۔

علامت اور تجرید کے اسی مذکورہ کینوس پر چند کہانیاں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں افسانہ نگار کوئی بڑا تاثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔ ان کہانیوں میں ’ناممکنات کے درمیان‘ اور براوو! براوو شامل ہیں۔ دونوں کہانیوں میں ادق اور پیچیدہ فکری مسائل، تمام تر بڑے پس مناظر کے باوجود فن کی منتہا تک نہیں پہنچتے۔ اول الذکر کہانی کا آغاز انتہائی ڈرامائی اور دلچسپ ہے لیکن اپنے ابتدائی حصے کے فوراً بعد کا تخلیقی حصہ، اسلوب کی ثقالت اور موضوع کی ثقاہت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے کسی قدر مختلف بحرانی معاملہ براوو! براوو کو درپیش ہے یہاں عہد عتیق و جدید، سینٹ آگسٹائن آف ہپو اور ابن العربی سے لے کر زرتشت اور ابن ہشام تک کے حوالے موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ کہانی اپنی وسیع اور فکر انگیز رمزیت کے باوجود مجموعی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور اس کی بنیادی وجہ کہانی میں پیش ہونے والے مرکزی کرداروں کی وہ غیر سنجیدگی ہے جو موضوع کی سنجیدگی سے ہم آہنگ نہیں۔ یوں ایک بڑے پس منظر میں تخلیق ہونے والی یہ تحریر اپنی پیش کش کے اعتبار سے متاثر کن نہیں رہتی۔

اب ہم افسانہ نگار کے فکر و فن کے اس باب کی طرف آتے ہیں جو نہ صرف دلچسپی اور تاثریت سے مزین ہے بلکہ یہ زندگی کو اس نہج پر دکھاتا ہے جو فرد، قوم اور معاشرے کی بقا کا ضامن بھی ہے اور ایک بڑا آدرش بھی۔ باب کے اس حصے میں اسد محمد خان انسان کے جوہر کو نکھرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سوجھ بوجھ والے شخص کو خود شناسی کے مرحلے سے گزر کر زندگی، اس ڈھب پر گزارنی چاہیے جو اوروں کے لئے مثالی اور قابل تقلید ٹھہرے۔ ذات کے جوہر کی یہ تلاش اور پھر اس کی پرورش و پرداخت ان کی کئی کہانیوں میں پھیلی نظر آتی ہے۔ مثالیت پسندی کا یہ رویہ انہیں علامہ اقبال، پالو کیلو اور حضرت علیؓ کے نزدیک لے آتا ہے۔ اسد محمد خان انسانوں کو جری، غیرت مند اور بااصول دیکھنا چاہتے ہیں۔

اور پھر انسانوں سے مراد صرف مرد ذات ہی نہیں بلکہ عورت بھی، اس میں برابر کی ساجھے دار ہے۔ وہ زندگی کو جوں کا توں بھی دکھاتے ہیں لیکن زندگی جیسی ہونی چاہیے وہ بھی کر دکھاتے ہیں اور یوں ان کا رئیلسٹ فنکار آئیڈلسٹ ہو کر ہمیں زندگی کے برتر شعور کا پیغام دیتا ہے۔ انسان کو نالی کا کیڑا بنتے دیکھنا انہیں منظور نہیں وہ اسے

بلند مقام و مرتبے پر متمکن دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسانی جوہر کے تراشنے خراشنے کا یہ معاملہ ان سے متعدد خوبصورت کہانیاں لکھواتا ہے اور پھر ان کہانیوں میں وہ اور یجنیلٹی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ کہیں بھی جذبات و احساسات کی تندی، کہانی کے فطری رنگ کو مٹیالا نہیں کرتی۔ 'ہٹلر، شیر کا بچہ'، 'موتبر کی باڑی'، 'نربدا'، 'داستان سرائے'، 'مرد، عورت، بچہ اور سلوتری'، 'ایک دشت سے گزرتے ہوئے'، 'خفت میں پڑا ہوا مرد'، 'تصویر سے نکلا ہوا آدمی'، 'سرکس کی ایک سادہ کہانی' اور 'قافلے کے ساتھ ساتھ' وہ خوبصورت کہانیاں ہیں جو افسانہ نگار کے مطمح نظر کو مکمل خود سپردگی سے پیش کرتی ہیں۔ انسانی جوہر کے ضائع ہونے کو وہ انسان کے ضائع ہونے کے مترادف جانتے ہیں۔ ایسا انسان جیے یا مرے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

> ''میں نے سوچا اس کا FORTE تو اس کا لشکارے مارتا ذہن ہی تھا ذہن نہیں رہا تو باقی جو بچ رہا وہ سعید الدین احمد تو نہیں ایک HULK ہے۔ ایک صحت یافتہ ویجی ٹیبل۔ میری دلچسپی ختم ہوگئی۔''[۱۱] (طوفان کے مرکز میں)

وہ جانتے ہیں کہ بعض معاملات میں انسان بے بس ہے لیکن بہت سے معاملات میں وہ خود کفیل اور امور کے نپٹانے میں سراسر خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ اسی ذمہ داری کا خاص طور سے تعین کرتے ہیں۔

انسانی جوہر کی اس جستجو کے باوجود وہ مہابیانیوں سے دور رہتے ہیں۔ وہ کسی منطقی، وجودی، مظہریاتی، لسانی اور نوآبادیاتی فلسفے سے کہیں دور انسانوں کو مرکزہ فکر بنائے اپنی کہانیوں کو انسانوں کی تہذیب و معاشرت اور تاریخ کے آوے پر چڑھا کے جادوگر لکھیروں کی مانند جذب و احساس کی چوڑیاں بناتے ہیں۔ وہ ریئلسٹ ہونے کے باوجود آئیڈلسٹ ہیں۔ انسانی دکھوں اور فطرت کی ٹوٹ پھوٹ پر کڑھتے ہیں۔ ہر طرح کے استحصالی نظام کے خلاف ہیں خواہ اس کا ذمہ دار متعصب دین دار ملا ہے یا پھر مغرب کا سامراجی نظام۔ سچائی کی تلاش میں زمانوں اور جہانوں کی خاک چھانتے ہیں اور پھر 'طوفان کے مرکز میں' رہ کر شانت اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

کہانیوں کا مجموعی جائزہ انہیں پوسٹ ماڈرنسٹ افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ تاہم شناخت کا یہ عنوان شاید ان کے تعارف کا کوئی بڑا حوالہ نہ ہو۔ ان کا فن پھیلی ہوئی اس فراخ اور کشادہ زرخیز زمین کے مانند ہے جو نوع نوع کے اشجار و پھل پات کی نمو کرے اور چھتنار درختوں کے وسیلے سے سکون و عافیت کا سکھ بانٹے۔

حوالہ جات:

۱۔ اسد محمد خان۔ جو کہانیاں لکھیں، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۶ء ص ۵۹

۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۴۔ ایضاً، ص ۴۳۸

۵۔ اسد محمد خان۔''قافلے کے ساتھ ساتھ''، دنیازاد۲۳ (اکتوبر ۲۰۰۸): ص۶۱
۶۔ اسد محمد خان۔ تیسرے پہر کی کہانیاں، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۶ء ص ۳۱
۷۔ اسد محمد خان۔ جو کہانیاں لکھیں، ص ۴۹۱
۸۔ ایضاً، ص ۴۹۱
۹۔ ایضاً، ص ۵۷۷
۱۰۔ سعادت سعید، ڈاکٹر۔ جہت نمائی، لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۵ء ص ۱۴
۱۱۔ اسد محمد خان۔ جو کہانیاں لکھیں، ص ۳۳۷